جملہ خوبیوں اور خوابیوں سے مرصع ہے۔جب چاہے دشنام دے۔جب جی آمادہ ہو خلعت بخش دے اللہ اللہ خیر صلاح۔

ارجمند جب گھر سے نکلتی ہے تو دونوں بچے ساتھ ہوتے ہیں۔آوازیں آتی ہیں۔

''قیصر get quick........I am getting late.....''

''سینڈوچ رستہ میں کھانا کم آن۔۔۔۔۔''

''جمشید یوفول۔۔۔۔۔اب کیا ہوا ہے؟۔۔۔۔۔''

''میں نے گاڑی آن کردی ہے۔۔۔I can,t wait any more''

''اگر تم لوگ دومنٹ مین نہ آئے تو میں تمہیں چھوڑ جاؤں گی۔۔۔۔۔۔''

''This is hell.........''

یہ آوزیں بچوں کے لود ہونے تک آتی رہتی ہیں اور ہمیشہ کے لیے ان کے اند پروگرام ہو جاتی ہیں۔۔۔ایک روز میں نے ارجمند سے ڈرتے ڈرتے کہا۔۔۔۔

''تم اس قدر پریشان جو ہوتی ہو تو نوکری چھوڑ دوناں۔۔۔۔۔۔''

''ہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔یہی نوکری تو میری اپنی ہے۔۔۔۔۔باقی میرے پاس اپنا کیا ہے؟''انسان کے پاس اپنا ضرور کچھ ہونا چاہیئے ،ابا چاہے ہتھوڑی کا دستہ ہی کیوں نہ ہو۔

''کتنے پیسے ملتے ہیں تمہیں؟''

''ہزار ڈالر۔۔۔۔۔''

''تو کیا تمہیں بلال کافی رقم نہیں دیتا۔۔۔۔''

''پیسے تو بہت دیتے ہیں،لیکن یہ ایک ہزار میرے پاس میرے اپنے ہیں۔میری اپنی کمائی ان دس انگلیوں کی ،مجھے ان پیسوں سے آزادی کا احساس ہوتا ہے۔انہیں

میں جہاں چاہوں خرچوں۔"

"میرے اپنے سے کیا مراد ہے؟"

"ان کا جو کچھ مرضی میں کروں۔میں ان کے لئے Accountable نہیں ہوں۔"

"ارجمند۔۔۔۔یہ تمہاری زندگی ہے اس کے سارے فیصلے تمہارے ہونے

چاہئیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم جمشید اور قیصر کے لئے بھی جواب دہ ہو۔۔۔۔وہاں تمہاری مرضی نہیں چل سکتی۔"

"تو میں ان کی ساری ڈیوٹی دیتی ہوں ابو ۔۔۔سارے کام میرے ذمہ ہیں۔بلال تو واپسی پر صرف فٹ بال کا میچ ٹیلی ویژن پر دیکھتا ہے۔۔۔۔کھانا کھاتا ہے اور سو جاتا ہے روٹیاں sleeping full toss....eating"

"اور ویک اینڈ پر تمہیں اور بچوں کو تفریح کے لئے شہر سے دور لے جاتا ہے ۔۔۔۔دودھ کی بھاری بوتلیں، آٹے کی تھیلے ساری گرسریز لاتا ہے۔پھر جگہ جگہ رکھتا ہے اور ایپرن لگا کر برتن دھوتا ہے۔ملازم منڈو کی طرح اور سارے کپڑے استری کرتا ہے تمہارے اور بچوں کے ....Vacum کرتا ہے سنڈے کو۔"

"ابو ایک بات بتائیں۔۔۔۔"

میں سر میں انگلی پھیر کر پوچھتا ہوں۔۔۔"کیا؟ کیا بات بتاؤں۔"

"آپ میرے ابو ہیں کہ بلال کے؟۔۔۔۔آپ کو مجھ سے محبت ہے کہ بلال سے۔"

میں اس کی بات کا جواب نہیں دے سکتا، کیونکہ مجھے بلال پر ترس آتا ہے۔ارجمند سے مجھے پیار ہے، لیکن ارجمند کے رویے میں کچھ ایسی بدلحاظی یا دیانت داری ہے کہ اگر میں بلال کی جگہ ہوتا تو شاید برداشت نہ کر سکتا۔ارجمند ہر معاملے میں

اس قدر برابری کی خواہاں ہے کہ اگر اس کا بس چلتا تو جمشید کی پیدائش کا ضامن بلال ہوتا اور قیصر کو وہ جنم دے لیتی۔ نہ وہ حیاتیاتی فرق سمجھتی ہے نہ ہی اسے مرد اور عورت کے جداگانہ رولز کی سوجھ بوجھ ہے۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے۔ آپ کو مجھ سے محبت ہے کہ بلال سے۔''

''ابو تو میں آپ کا ہی ہو۔ محبت بھی تم ہی سے ہے۔۔۔ لیکن میرے خیال میں بلال مظلوم ہے۔''

''ہر وہ آدمی جو Male Chauvanism میں یقین رکھتا ہے ایسے ہی سمجھتا ہے ابو کہ مرد مظلوم ہے اور عورت آپے سے باہر ہو رہی ہے۔۔۔۔ یہ عورت سے بے انصافی ہے۔ سراسر بے انصافی۔ عورت سو جوتیاں بھی کھا رہی ہے اور سو پیاز بھی۔''

''لیکن اپنی مرضی سے اپنی چوائس سے'' میں عرض کرتا ہوں۔

''آپ کی شوچ تیڑھی ہے ابو ۔۔۔۔ پلیز سیدھا سوچنا شروع کریں ۔۔۔ وقت بدل چکا ہے۔ اب پتھر اور دھات کا زمانہ نہیں۔''

''یقیناً یہ میڈیا، رفتار اور اشیا کا زمانہ ہے۔۔۔ لیکن اندر ایک روح جدید نہیں ہو سکا۔ بدقسمتی سے وہ گوشت پوست کا بنا ہے۔۔۔ اس کے اندر ایک روح بھی ہے جو اتنی پرانی ہے۔۔۔ اتنی پرانی ہے جتنا انسان خود۔۔۔ اس روح کے سوالات بھی پرانے ہیں اور جواب بھی وہی چلے آتے ہیں۔''

''ابو یہ بحث اب اس زمانے میں لاگو نہیں رہی ۔۔۔۔ خدا کے لئے اپنی سوچ بدلیں۔ پرانی جہالت چھوڑ دیں چھوڑ دیں۔''

''اچھا۔۔۔۔ یہ بتاؤ تم خوش ہو ارجمند؟'' میں نے سوال کیا۔

وہ چند لمحے چپ رہی پھر بولی۔۔۔ ''پتہ نہیں؟''

''کیوں؟۔۔۔۔۔''

''ٹھیک ہے جواب مجھے بھی معلوم نہیں۔''

''اچھا یوں کرو ارجمند ۔۔۔۔تم دونوں واپس چلو پاکستان وہاں ۔ نہ تمہاری لائف ٹف ہوگی نہ بلال کی ۔۔۔تمہارے پاس ملازموں کی پلٹن ہوگی اور تمہیں اتنا کام نہیں کرنا پڑے گا۔بیگم بن کر عیش کرنا بیگماتی نظام وہاں خوب چلتا ہے صبح بارہ بجے اٹھنا ،گیارہ بجے بازار کھل جاتے ہیں وہاں گھومنا ۔۔۔۔کافی پارٹیاں غیبت ،چغلی،میٹنگ،سکینڈل ۔۔۔دھونس شورشرابا۔آرزوئیں ہی آرزوئیں۔''

illiterate "ابو۔۔۔ایسی بری بات منہ سے نہ نکالیں god fobid

fools کی پلٹن رکھ کر مجھے آرام ملے گا توبہ کریں I hate servants میں نے بڑی جرائت سے کہا۔۔۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہاں تمہارا خاوند ملازم ہے۔اس سے بڑی ذہنی عیاشی اور کیا سکتی ہے کہ اپنا شوہر آداب بجالانے کے لئے موجود رہے،سارے آڈر مانے اور استعفٰی نہ دے سکے۔۔۔''

صدیوں سے مرد نے عورت کو domestic servant کی طرح استعمال کیا ہے ابو ۔۔۔اب تھوڑا سا ہاتھ بٹا کر کیسے چیں چیں کرتا ہے اورتو اور باپ بھی اس discrimination میں شامل ہوگیا ہے۔وہ بھی بیٹی کا ساتھ نہیں سکتا کیونکہ وہ بھی بالآخر مرد ہے''

''پیاری بیٹی۔۔۔میری چاندسی ارجمند۔۔۔۔''

''چاپلوسی I Hate''

ارجمند کی سچائی مجھے شرمندہ کردیتی ہے۔۔۔۔۔

''ابو آپ بھول رہے ہیں۔ہم پاکستان کے عذابوں سے نکل کر یہاں آئے ہیں۔آپ مجھے واپس اسی گھٹے گھٹے ماحول میں گرمی اور دھول میں،احمق جاہل تنگ نظر لوگوں میں بلا رہے ہیں جن کے پاس ٹائم غیبت ،کھانا ،ہلڑ بازی اور بدتمیزی ہے۔۔۔اتنے Exposure کے بعد میں کنوئیں کا مینڈک نہیں بننا چاہتی۔''

''اگر تم جیسے روشن دماغ یہاں بیٹھے رہے تو وہاں کیسے ترقی ہوگی ارجمند ۔۔۔۔بیک ہوم لوگ کیسے بدلیں گے؟''میں خوامخواہ کہتا ہوں''

''مجھے معاف کریں ابو ،ہم اس دنیا مین سوشل ورک کے لیے نہیں آئے۔۔۔ایک زندگی ہے اسے ہم انجوائے کو سکتے ہیں تو کیوں نہ کریں ۔جب ہم چیزیں Afford کرسکتے ہیں کیوں نہ خریدیں ۔جب ہم بہتر معیار زندگی اپنا سکتے ہیں تو کیوں نہ اپنائیں ابو۔۔۔۔زندگی صرف ایک بار ہے۔۔۔۔''

''ہاں بیٹی بابر بادشاہ بھی یہی کہتا تھا کہ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔۔۔ملسمان ہوکر اسے مابعد پر یقین نہیں تھا۔۔۔۔''میں یہ بات ارجمند کو دل میں کہتا ہوں ۔با آواز بلند کچھ بھی کہنے کی جرائت نہیں کرسکتا کیونکہ ایک بار جب اولاد اپنے پاؤں پر کھڑی ہوجاتی ہے تو ماں باپ ان بیساکھیوں کا سہارا نہیں لے سکتے۔

میں خاموش ہوجاتا ہوں ۔دنیاوی ترقی کی یہ Epicurian فلاسفی مجھے آگے بولنے نہیں دیتی ۔یہ انداز فکر روزازل سے چلتا چلاتا یہاں تک پہنچا ہے ۔اماں حوّا نے بھی ممنوعہ کا ذائقہ چکھنے کی ترغیب دی تھی تو مقصد صرف فیصلے کی آزادی اور ذاتی خوشی کا حصول تھا۔

میں ارجمند کے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتا۔۔۔۔وہ تیز چلتی ہے ۔اس کی بات میں قطعیت ہوتی ہے ۔وہ اس قدر خود اعتماد ہے کہ اردگرد کیا کچھ ٹوٹ جاتا ہے اس کی ارجمند کو پرواہ نہیں ۔جس طرح وہ اپنے یہودی ڈاکٹر سے ڈرتہ ہے،ایسے ہی میں بھی اس کے اندر کی کرختگی سے خوفزدہ ہوجاتا ہے۔۔۔۔میں موضوع بدل کر کہتا ہوں۔

''اس بار ویک اینڈ پر کیا پروگرام ہے؟''

''اس بار ہم واشنگٹن ڈی سی جائیں گے ۔وہاں ٹریڈ منسٹر نثار صاحب سے ملیں گے۔''

''نثار کون سا نثار۔۔۔۔۔''میرے اندر خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔

نہ جانے یہ نام میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتا۔

چالیس سال سے یہ ٹینس پلیئر گریگوری پک جیسا حسین، بڑا اونچا بیور کریٹ میرے ساتھ ساتھ ہے۔میں نے اسے دیکھا نہیں، لیکن میرے انداس کی شبیہ بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہے۔میں نحوست کے تعویذ کو گلے سے اتار کر پھینک نہیں سکتا۔

''نثار صاحب کی بیوی کا کیا نام ہے؟''

''اقبال نام ہے لیکن انکل کچھ اور بلاتے ہیں۔وہ کہتے ہیں۔اقبال نام عورتوں پر جچتا نہیں۔۔۔۔۔اقبال مردوں کا نام ہے۔''

''کیا بلاتے ہیں انکل نثار۔۔۔۔اقبال کو؟''

'جاناں۔۔۔۔''ارجمند ہنستی ہے

شاید وہ سمجھتی ہے میری عمر کے آدمی کو یہ لفظ استعمال کرنا تو دور سننا بھی نہیں چاہیے۔

پتہ نہیں کیوں مجھے غصہ سا آگیا۔بھلا ٹریڈ منسٹر نثار اقبال کو جاناں کہنے والا کون ہوتا ہے؟۔۔۔۔۔

بڑی پرانی یادیں تیز آندھی بن کر مجھے اڑائے پھرتی ہیں اور میری یاداشت میں گھپلے پڑنے لگتے ہیں کبھی لگتا ہے ماضی آج زندہ ہے۔کبھی محسوس ہوتا تھا کہ کبھی کچھ تھا ہی نہیں۔بس ایک خواہش کی خوشبو تھی جس نے ساری یادوں کو مہکا رکھا ہے۔۔۔۔اتنے سارے غصے کی وجہ سے مجھے پتہ نہیں چلتا ارجمند کیا کہتی رہی اور کس وقت اٹھ کر چلی گئی۔

بوڑھے آدمی کے پاس ویسے بھی کون بیٹھنا چاہتا ہے؟اور پھر بوڑھے آدمی کے پاس سوچوں کے علاوہ ہوتا بھی کیا ہے؟

امریکہ آنے سے پہلے مجھے اپنی یاداشت کے متعلق کچھ ایسے شبہات نہ تھے ۔آئینے میں صورت دیکھنے کے باوجود سارے بال سفید ہو جانے کے باوصف مجھے شبہ نہ تھا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہاں۔ مجھے کتابی علم تھا کہ ارجمند چالیس کی ہو چکی ہے۔اخبار میں کبھی کبھی کسی پرانے ساتھی سے چھٹم چھٹا ہو جاتا۔ مسجد سے بھی ایسے ناموں کی موت کا اعلان ہوتا رہتا جن سے واقفیت تھی اور جن کی نماز جنازہ پڑھنے کے لیے مولوی صاحب بلا رہے تھے ۔چلتے چلتے لوگ بچھڑتے جا رہے تھے۔اب زیادہ تر ہسپتال ،عیادت اور مرگ کی رسومات میں جانے کا اتفاق ہوتا ۔لیکن خود مجھے اپنے مرنے کا احساس تو درکنار بوڑھے ہونے کی بھی اطلاع نہ ہوئی۔ میں ہمیشہ اندر کے موسم بہار کی رت کا اندازہ لگاتا آیا ہوں۔۔۔۔اور اندر کی رت نے مجھے زیادہ تر بہار کا ہی سندیسہ دیا۔

میری جیب میں امریکہ کا ٹکٹ تھا اور ہاتھوں میں وہ اخبار تھا جس میں خبر چھپی تھی کہ نثار کا انتقال ہو گیا۔ابھی اسی فیڈرل سیریٹری فنانس سے ریٹائر ہوئے دو چار مہینے ہی ہوئے تھے کہ اچانک وہ ہارٹ اٹیک سے چل بسا۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن میرے دل نے یہ جاننے میں جلدی کی کہ ہو نہ ہو یہ وہی نثار تھا جس سے اقبال کی شادی ہوئی ۔خبر پڑھ کر دل کو ایک گونہ اطمینان ہوا۔اقبال تو سرکاری افسر کے ساتھ گھونگھٹ نکال چلی گئی ۔میں ہال روڈ کی دوکان پر ریڈیو،ٹیپ ریکارڈ مرمت کرنے والی دوکان میں رگیدا گیا۔میری آمد نثار سے بہت زیادہ تھی،لیکن اس کا سٹیٹس مجھ سے کہیں بہتر تھا۔اب میری عمر میں سوچ کسی خاص سمت پر رک رک کر تصویر بدلتے رہنے کا عمل بوڑھے کے دماغ پر وسس کو بیان کر سکتا ہے۔بوڑھا بندر کی طرح کبھی ایک شاخ پر کبھی دوری پر چھلانگ لگاتا ہے۔وہ عموماً اپنی یاداشت کے ہاتھوں گومگوں کے عالم مین رہتا ہے قوت فیصلہ کا یہ عالم رہتا ہے کہ میری طرح اسے کئی بار امریکہ کی

ٹکٹ بدلوانا پڑتی ہے۔اس روز جب میں لاکروں کے سامنے کھڑا تھا میرا یک ہی سوچ تھی۔انتقال کی خبر پڑھ کر میں سوچنے لگا کیا اقبال اسی خبر والے نثار یک بیوی تھی۔وہ شخص جو ہارٹ اٹیک سے فوت ہوا جس کو میں تو اس اخبار کی سرخی کے ساتھ دفن کر چکا تھا۔یہ نیا نثار ارجمند والا کون کون تھا؟ کیا وہ ہماری اقبال کا شوہر بھی تھا۔ ارجمند نے ٹریڈ منسٹر کا شوشہ چھوڑ کر مجھے ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر تذبذب میں ڈال دیا۔

کیا قابل کا شوہر ٹریڈ منسٹر کے روپ میں زندہ ہے؟

کیا اقبال اس نثار کی بیوی تھی جس کی تصویر اخبار میں چھپی تھی اور جس اخبار کو لے کر میں امریکہ آنے سے پہلے بنک گیا تھا اور اس کی موت پر خوش تھا۔آج ان دونوں نثاروں نے مجھے ہلکان کر دیا۔اس روز اخبار پڑھ کر میں مطمئن تھا کہ اقبال کا شوہر فوت ہو گیا۔آج ارجمند نے اچانک ٹریڈ سنٹر کی Efigy پیش کر کے مجھے حیران کر دیا۔

میں نے مرحومہ اصغری کے زیورات کے ساتھ کچھ ڈالر بھی ایک منی ایکسچینجر سے لے کر چھپائے ہوئے تھے۔مجھے اچھی طرح یاد نہ تھا کہ کل کتنے ڈالر لاکر میں ہیں۔سارا زیور کتنی مالیت کا ہے.....

اس بینک کے لاکر تہہ خانے میں تھے۔تہہ خانے میں ان ڈور پلانٹر کے باوجود ٹھہری ٹھہری بوسیدہ سی ہوا تھی۔ایک جانب پرانے ریکارڈوں کو تھیلوں بوریوں میں بند کر کے ڈھیر لگا رکھا تھا۔لوہے کی ایک میز پر آٹو میٹک نیون کی بتی دھری تھی۔ جونہی بجلی جاتی وہ جل اٹھتی..... میں سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا تو لاکرز اور پریٹ کرنے والی نوجوان خاتون کمپیوٹر میں مگن تھی..... کمپیوٹر میرے علم کی حدود سے باہر ہے۔یہ وہ انفرمیشن اگلونے والا آلہ ہے۔جس نے ہماری پود اور نئی صدیوں کا فاصلہ پیدا کر دیا

اور اس کی انفرمیشن نے جگہ جگہ مغائرت اور غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے۔

''سلام علیکم'' میں نے لجاجت سے کہا..... بوڑھے آدمی میں یہ احساس قابل ترس ہے کہ وہ Welcome نہیں۔ وہ نرمی' وہ اچھے آداب اور باسی مسکراہٹ کے ہتھیاروں کی مدد سے تازگی پروار کرتا ہے۔ مس سر کے اشرے سے جواب دے کر کمپیوٹر کے بٹن دباتی رہتی ہے۔

''مس مجھے اپنا لاکر اوپریٹ کرنا تھا'' میں خوشامد سے کہا

مس ہرگز مس نہ تھی۔ وہ بھرے جسم کی عورت تھی۔ جس کے کندھے' گردن اور سینہ صحت اور اعتماد کی نشان دہی کر رہے تھے۔ اس نے دراز سے ماسٹر چابیوں کا گچھا نکالا۔ رجسٹر میں تاریخ اور وقت کا خانہ پر کر کے سائن کرنے کے لیے رجسٹر میری جانب بڑھا دیا..... میں نے جلدی سے دستخط کیے۔ وہ ترنت پھرنت لکڑی کی ہیلوں والی جوتی ٹکٹکاتی لاکروں تک جا پہنچی۔

دستخط کرنے کے بعد میں نے دماغ پر زور دیا لیکن مجھے اپنے لاکر کا نمبر بھول چکا تھا' اس سے پہلے بھی بھول چوک کا تھوڑا بہت سلسلہ جاری رہا تھا۔ لیکن یوں میری خجالت کا باعث نہ ہوا تھا۔ مجھے پہلی بار خیال آیا کہ شاید میں بوڑھا ہو چکا ہوں یا ہو رہا ہوں یا ہو سکتا ہوں۔ میں شرمندہ شرمندہ اس کے پیچھے گیا۔

''سنیے مس.....''

پلی پلائی عورت مس کا لفظ سن کر مسکرا کے پلٹی۔

''جی انکل.....؟''

انکل کا لفظ چھوٹے بچے میرے لیے استعمال کرتے رہتے تھے۔ لیکن یہ پہلی بار تھی کہ اتنی بڑی عمر کی خاتون نے انکل کہہ کر مجھے بوڑھا ثابت کیا۔

''میں اپنے لاکر کا نمبر بھول گیا ہوں''

''اچھا تو آپ اپنی چابی تو ساتھ لائے ہیں ناں'' مس نے پوچھا.....

''جی جی..... چابی تو میری کاروائی چابی کے چھلے میں ہے.....''میں نے چھلے کو جیب سے نکالتے ہوئے کہا

''آپ لاکر پہنچان تو لیں گے نان.....؟''وہ مسکرائی۔

''ہاں.....شاید پہنچان لوں گا.....''مجھے یقین نہ تھا۔

اب میرے اندر ایک خاص قسم کی سٹپٹاہٹ شروع ہوگئی تھی جیسے ریس سے پہلے کھلاڑیوں کے اندر پیدا ہو جاتی ہے.....سامنے لاکرز کی الماریاں بالکل چپ کھڑی میرے حافظے کے لوٹ آنے کا انتظار کر رہی تھیں۔

''کوئی بات نہیں انکل۔آپ کی ایج میں کئی لوگ لاکرز کے نمبر بھول جاتے ہیں۔میں نے دماغ پر بہت زور دے کر تین سو پچھتر نمبر کے لاکر کو ہاتھ لگایا.....مس نے اپنی ماسٹر چابی گھمائی۔پھر میں نے اپنی چابی اس میں فٹ کی۔گھمایا لیکن لاکر نہ کھلا۔میرے پاؤں میں ہلکا ہلکا پسینہ آ گیا.....اور یکدم چکر سا محسوس ہوا۔

''شاید 377 نمبر ہو.....مجھے یاد پڑتا ہے.....''

''ضرور ضرور ٹرائی کر لیتے ہیں''

اس بار ہم دونوں کی چابیاں لگنے سے لاکر کھل گیا.....

''دیکھیے انکل آپ اپنی چابی کے ساتھ اور اس لاکر پر کوئی سٹکر لگا لیں۔نشانی رہے گی۔پتہ ہے انکل یہ آپ دیکھیے ناں کتنے لوگوں نے سٹکرز لگا رکھے ہیں۔

کچھ لوگ تو وطن سے باہر ہیں۔ان کے لاکرز تو برسوں سے Operate ہی نہیں ہوئے انکل.....پتہ نہیں واپسی پر ان لاکروں کو کیسے پہچانیں گے''

مس مجھے تھوڑی سی ڈانٹ اور ہلکی سی تسلی دے کر چلی گئی.....

یادداشت کی سلیٹ یوں صاف ہو جانے کا یہ پہلا دھچکا لگا۔

میں نے لاکر کھول کر اپنی جمع جتھہ نکالی۔انعامی بانڈز گنے'قومی بچت میں لگائی

رقم کا پڑتا لگایا' ڈالروں والا لفافہ نکال کر ڈالر گنے۔ کاغذات میں دفن دولت کا شمار کرنے کے بعد میری نظر پلاسٹک کے ایک لمبوترے نیلے ڈبے پر پڑی۔ اس کے ساتھ ایک چاکلیٹ کا ڈبہ بھی موی لفافے میں لپٹا پڑا تھا ان دونوں کو میں نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ میں نے صرف پلاسٹک کا نیلا ڈبہ نکالا اور اپنی بہو کا زیور چاکلیٹی ڈبہ وہیں رہنے دیا۔ ہم دونوں کا لاکر سانجا تھا۔ اس لیے نہیں کہ میری بہو مجھ پر اعتماد کرتی تھی' بلکہ اس لیے کہ اگر مجھے کوئی ہرج مرج ہو جائے تو وہ سانجھا لاکر ہونے کے باعث اس لاکر کو اوپریٹ کر سکیں۔ اپنے ارادے کو شفاف بنانے کے لیے اس نے مجھ پر اعتماد کرنے کو سستا سودا سمجھا.....

میرے دل نے نیلا ڈبہ نکالتے وقت کہا..... "جناب ہمایوں صاحب! اگر آپ امریکہ میں فوت ہو گئے یا واپسی پر آپ کا دماغ جیلی فش بن گیا تو اس نیلے ڈبے کا کیا بنے گا۔؟"

جیتے جی میں اصغری کا زیور کسی دینا نہیں چاہتا تھا۔ کندن کے سیٹ' نورتنوں کے لمبے ہار' چوڑیاں کڑے' لمبے لمبے مگر..... میں نے ارادہ کیا کہ یہ سب کچھ میں ارجمند کے لیے لے جاؤں گا..... میں اسے ڈکلیئر کیے بغیر لیجانے کی کوشش کروں گا..... اگر پکڑا گیا تو زیور بھی گیا اور نیک نامی بھی.....

لیکن پھر یہ سوچ کر میں نے ارادہ پختہ کر لیا کہ یہ نیلا ڈبہ لاکر ہی میں رہ گیا تو میرے بعد کس کام آئے گا..... میں اس کا کیا بنا لوں گا؟..... اقبال تک تو پہنچنے سے رہا۔

ہر ملک میں اپنے ہی توہمات ہوتے ہیں اور تعلیم یافتہ ہو کر بھی سائنسی ترقی کے باوجود یہ پیچھا نہیں چھوڑتے۔ نیگرو لوگوں کا اعتقاد ہے کہ آنگن میں اگر سفید چوزا گھومتا پھرتا ہو تو بدروحیں وہاں نہیں آتیں۔ برصغیر میں کالی بلی اگر راستہ الانگ جائے تو کام

اڑچن پڑ جاتی ہے۔کوامنڈیر پر کائیں کائیں کرتے من چاہا مہمان آتا ہے۔بھونرا گھر کے اندر داخل ہوتو اچھی خبر ملتی ہے۔چلتے پھرتے میں چھپکلی چھت سے آپ کے بدن پر گر جائے تو ترقی ملتی ہے۔ایسی ہی اس روز بھونرا ارجمند کے گھر میں اڑتا پھرا تو مجھے لگا میں اقبال سے دور نہیں ہوں۔شاید میں اسے ٹریڈ منسٹر کے گھر میں مل سکوں۔

لیکن شہری زندگی بالکل مختلف ہے۔شہد کے چھتے کی طرح ہر لمحہ منظر بدلتا چلا جاتا ہے۔شہری ترقی کا ایک گن یہ بھی ہے کہ اس میں عام شہری دیر پا' بہت سوچ بچار کے بعد فیصلے نہیں کرتے۔عام طور پر امریکی لوگ ترقی کا سمبل ہیں۔'وقتی Impulse پر فیصلہ کرتے ہیں۔جذبات کے چڑھاؤ کے بعد اس کے اتار کے متعلق ان کو کوئی فکر نہیں ہوتا۔تھوڑی دیر کے لیے بہت Involve ہو سکتے ہیں۔جی چاہا چندہ دے دیا۔من میں خواہش اٹھی تو ماں سے ملنے چلے گئے۔باپ کے لیے تحفہ خرید لیا۔وہ وفا کا بیج سینے پر لگا کر ہمیشہ کا درد سر نہیں پال سکتے۔ماں باپ کی مستقل دردسر' بک بک' جھک جھک' صبح وشام کے اختلافات ان کے بس کی بات نہیں ہے۔بچے کو کئی سال کو لہے پر چڑھا کر پرورش کرنا ان کو پر ملال کرتا ہے۔اپنی Impulsive نیکی کے ہاتھوں وہ بوڑھے گھر Shelters Day care Centres بنا سکتے ہیں۔ اپنے گھروں میں کسی شخص کی مستقل بک بک جھک جھک برداشت نہیں کر سکتے۔وہ جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں لیکن ہمیشہ کیلئے جذبات کے تابع نہیں رہ سکتے..... جہاں عمل تو اتر آیا یکسانیت پیدا ہوئی.....امریکی باشندہ بور ہو کر راستہ بدل جاتا ہے۔اسے یا تو بریک درکار ہوتی ہے یا علیحدگی!

دادا زمین سے وابستہ کسان تھا۔اسے دھرتی ماں سے بھی پیاری تھی۔وہ گاؤں چھوڑ کر آتو گیا لیکن اپنی زمین کے بغیر زیادہ عرصے تک جی نہ سکا۔اندر ہی اندر اسے

گاؤں کے گھر، وٹ بنے، کنویں، شہتوت اور لوکاٹ کی جھنگی، پکی سڑک تکجانے والا کچا رستہ کھلے میدان، ہرے بھرے کھیت، گلی ڈنڈا کھیلتے بچے، یکے پر آتی جاتی سواریاں، لسی کے ڈول مکھن بھرے سلور کے کٹورے یاد آتے رہے..... دادا گلی میں چارپائی ڈال کر نہ جانے کس کس بات کو کن زایوں سے یاد کرتا رہتا۔ اس گلی میں زیادہ تر سفید رو، کشمیری اور مغل پٹھان گھرانے آباد تھے۔ گلی میں آتے جاتے لوگ دادا کی عمر کا لحاظ تو کرتے اور سلام دعا کا سلسلہ بھی جاری رہتا..... لیکن ان کا بھی جی چاہتا کہ دادا اندر جا کر نہالیں، خاص کر گرمیوں میں جب دادا پگڑی سے لے کر نری کی جوتی تک پسینے میں نہایا نظر آتا۔ لوگوں کی یہ خواہش شدید تر ہو جاتی۔ اس گلی کے سفید باسی دادا کے رنگ کے ساتھ سمجھوتہ نہ کر سکے۔

دادا سمجھ نہ سکتا کہ وہ ہندوؤں کو تو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ یہ تعصبات کی گٹھڑی کون ساتھ اٹھا کر لے آیا۔ چار ورن تو مسلمانوں میں بھی موجود تھے۔ تو پھر دھرتی کو چھوڑنے کا فائدہ کیا ہوا.....؟ اپنے دل کا میل ہی نہ کٹا تو فائدہ؟

مہاراج ادھیراج شہنشاہ محمد جلال الدین اکبر نے بھی دین الٰہی بنا کر ایک کوشش کی تھی کہ تعصب چھوڑ کر دوسروں کو جینے کا برابر حق دیا جائے۔ ایسی ہی کوشش امریکہ بھی کرتا چلا جا رہا ہے۔ اقلیتیں چونکہ انکی معیشت کی ضرورت ہیں اور ان قلیتوں کے بغیر امریکہ کی خوش حالی آگے نہیں بڑھ سکتی، اس لیے وہ ہر ممکن طریق سے اکثریت کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اقلیت کو راضی رکھو۔ اس کم اجرتی محنتی طبقے کے بغیر ہم ساری دنیا پر راج نہیں کر سکتے۔ دین الٰہی کی طرح وہ ہیومن رائٹس کا چارٹر پیش کرتے ہیں لیکن امریکن اس Eyewash سے اپنے ملک کے Racists کو مطمئن نہیں کر سکتے۔ وہ سمجھ نہیں پاتے کہ تعصب قلب کی بیماری ہے اور جب تک انسان خود اپنے مسلک کا شیدائی نہ ہو اور دوسروں کو بھی اپنی طرح مختلف راستے کا پکا راہرو نہ سمجھے بات نہیں بنتی، فقط لبرل ہونے سے کام نہیں بن سکتا۔ ہر لبرل آدمی پہلے

اپنا راستہ چھوڑتا ہے اور پھر کسی اور کے راستے کو درست سمجھتا ہے۔اس کے پاس نہ اپنی اقدار باقی رہتی ہیں، نہ کسی اور کی اقدار کی وہ عزت کر سکتا ہے۔ضرورت اس بات کی نہیں کہ انسان بے رنگ ہو بلکہ سمجھنا یہ پڑے گا کہ ہر رنگ کی اپنی شان ہے۔اپنا مسلک چھوڑو نہیں اور کسی کا مسلک چھیڑو نہیں، ٹھیک مقولہ ہے...... یہاں تک شاید اسی وقت پہنچا جا سکتا ہے جب لوگ آخری خطبہ سمجھ پائیں گے۔کسی کو حیلے بہانے بری نیت سے برابر نہیں کرنا...... اس کے اور اپنے باہمی فرق کے آگے صرف اس لیے سر جھکانا ہے کہ یہ نبیؐ کا فرمان ہے۔ہماری گوری دادی نے کالے دادا کو کبھی برابر نہ سمجھا۔دادی گوری چٹی انگریزوں سی تھی۔میرا دادا کالا شاہ کالا تھا۔ جب پاکستان پہنچے تو ہماری عمریں تجزیے کی نہ تھیں۔ اہم واقعات پر ہم ہنس دیا کرتے تھے یا ان کا مذاق بنا کر ایک دوسرے کو چھیڑا کرتے تھے۔اس زمانے میں شادیاں طے کرتے وقت مردوں کی صرف کمائیاں دیکھی جاتی تھیں۔اس لیے دادا کو کسی نے جسمانی طور پر نہیں دیکھا پرکھا نہیں اور گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی بیاہ دی۔نتیجے میں میرے دادا کی اولاد ہوئی بر ڈھی۔ چاچا صمد گورے تھے۔میرا ابا اور دونوں پھوپھیاں سانولی مائل کالی تھیں اور ان کی شادیاں کرنے میں دادی کو کافی مشکلات پیش آئی تھیں۔لیکن یہ قیام پاکستان سے پہلے کے رگڑے جھگڑے تھے۔ہمیں تو دادا کیساتھ پاکستان میں رہنے کا تجربہ بھی کچھ خاص نہیں تھا۔ہم دادا کو دادی کی آنکھ سے دیکھتے تھے کیونکہ دادی ہماری آنکھ کا تارا تھی۔بوڑھی کبڑی، سفید بالوں والی میم سی دادی......

وہ عام طور پر دادا سے کہتی...... ”ہائے ہائے نہا لیں......“

دادا محبوب سی نظروں سے دادی کو دیکھ کر جواب دیتا......”بھلی لوک نہا کر ہی تو آ رہا ہوں......“

”منہ تو رگڑ کر دھو لیا کریں۔“

''وہ بھی رگڑا تھا۔ دانت بھی مانجھ لیے تھے''

''اچھا.....'' دادی منہ پرے کر کے دادا کو نظر انداز کر دیتی۔

ہم پانچوں بہن بھائیوں میں سے شاہد بھائی اور فریدہ کا رنگ گندمی مائل سانولا تھا۔ دادی گوری چٹی بہو لا کر بھی دادے کے تمام کالے جرثومے پوتے پوتیوں میں سے نکال نہ سکی تھی۔

ہم سب میں دادی کا لطیفہ زبان زد تھا۔ جب بھی موقعہ ملتا' رفعت آپا یا شاہد بھائی سے کہتی..... ''نہا لینا تھا شاہد.....''

''نہا کر تو آرہا ہوں.....''

''منہ تو رگڑ کر دھویا کریں بادشاہو.....''

ہم سب ہنسنے لگتے۔ ابھی ہمیں علم نہ تھا کہ دل جیسی نازک چیز کتنی معمولی باتوں سے دکھ جاتا ہے۔ ہم بہن بھائیوں کو ایک دوسرے کی محبت پر اتنا اعتماد تھا کہ ہمیں کبھی خیال ہی نہ آیا کہ شاہد بھائی واقعی سانولے ہیں۔

اقبال بھی شاہد بھائی کی طرف اسی لیے آمادہ نہ ہو سکی۔ شاید اس کا بھی جی اندر سے یہ چاہتا تھا کہ شاہد بھائی جلدی سے نہا کر آئی اور اتنے میلے میلے نہ لگیں۔

اس روز اماں مولی کے پراٹھے پکا رہی تھیں۔ ہم چاروں باورچی خانے میں نچلی تپائی کے گرد موڑھے لگائے بیٹھے ہوئے ہر پراٹھے کے پک جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ جب بھی پراٹھا توے سے اترتا ایک کہرام مچ جاتا۔ گرا پراٹھے کے ٹوٹے ٹوٹے ہو جاتے۔ اماں خوشی اور غصے کے ملے جلے جذبے کے ساتھ کہتی۔

''صبر کرو صبر کرو ہاتھ جل جائے گا..... اچھا چھری سے کاٹ کر بانٹ لو.....''

لیکن نہ ہم لوگ صبر کر سکتے۔ نہ بانٹ کر اپنے حصے کا پراٹھا کھا سکتے تھے۔ غدر جاری تھا جبا قبال آ گئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح ذومعنی مسکراہٹ کو چہرے پر سجائے ہوئے

تھی۔ گویا ہم پر ہنس رہی ہو یا شاید دل ہی دل میں گرویدگی کے ساتھ ہماری قدر شناس ہوا سے دیکھتے ہی میں شاخ بریدہ درخست کی مانند ہر آرزو سے خالی ہو گیا۔ صرف وہی آئینہ دل میں منعکس رہ گئی۔

''آئینے آئینے مولیوں کے پراٹھے چل رہے ہیں دہی کے ساتھ.....''

ڈگڈگی نما موڑھے سے میں اٹھ کھڑا ہوا

اقبال کی مسکراہٹ نہ پھیلی نہ سمٹی

''میں تو کھانا کھا کر آئی ہوں آپیا.....جی''

''پھر کیا ہے.....ادھر میرے ساتھ آجاؤ''

وہ میری جگہ آپیا کے ساتھ بیٹھ گئی لیکن جگہ تنگ تھی۔ جب وہ میرے پاس سے گذری تو کچھ ڈگمگا سی گئی۔ میں نے اسے سہارا دے کر سنبھالا۔ یہ سہارا دینے کا عمل چند لمحوں کا تھا۔ لیکن ایونگ ان پیرس میں مہکا ہوا' یہ ہوا کا بلا ساری عمر میرے ساتھ رہا۔

''نظر نہیں آتا جگہ تنگ ہے ابھی چولہے میں گرنے لگی تھی۔۔۔۔آپیا نے ڈانٹا

''اچھا ہوتا ناں.....''

کیا اچھا ہوتا؟ چولہے میں گر کر جلا؟.....''

اقبال نے میری طرف دیکھا.....پھر نظریں اس پراٹھے پر جمائیں جو میں چھوڑ کر اٹھا تھا۔ اس نے آپیا کی بات کا جواب نہ دیا اور آرام سے میرے والے مونڈھے پر بیٹھ گئی۔

میں نے صاف پلیٹ اسے دیتے ہوئے کہا.....''یہ صاف پلیٹ لے لیجئے''

یہ بھی ٹھیک ہے''

اس نے بڑی رمز سے پراٹھا توڑا اور مزے لے لے کر بولی.....''واہ جی واہ بڑا مزہ آیا.....ایسے پراٹھے خانسامے تھوڑی پکا سکتے ہیں۔''

"تمہیں اچھے لگتے ہی مولی کے پراٹھے؟..............."

"کوئی خاص نہیں لیکن یہ اچھے ہیں۔" اس نے ٹوٹے پھوٹے میں سے نوالہ توڑ کر کہا۔ میں آہستہ آہستہ ہاتھ دھوتا رہا۔ آپا اور اقبال میری پشت پر قریباً تین فٹ کے فاصلے پر تھیں۔ ان کی کھی کھی کھا کھا والی بدتمیز ہنسی میرا اندر مالیخم کی طرح اتر رہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں باورچی خانہ چھوڑ کر جاؤں۔ میں پھسل یا چل کر اقبال کے موڑھے سے ٹکرا کر گرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جب دادا ابا آ گئے۔

"اوئے ہوئے ووہٹی پرونٹھوں کی خوشبو تو گلی تک جا رہی ہے واہ واہ...... واہ واہ......"

اماں نے نگھی پیڑا پڑا اٹا چھوڑ کر سر کی بکل درست کی......

"آئیں بسم اللہ...... پر آپ نہائے بغیر کھانا نہیں کھائیں گے"

"لے پھر میں نہا کر آیا...... اس پچھیرا پلٹن کو بھگ دینا میرے آنے تک......"

ظفر اور فریدہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کو کھانے سے فرصت نہ تھی ورنہ کوئی جملہ کس دیتے۔

اس واقعہ سے قریباً ہفتہ بھر بعد دادا ایک رات سوئے اور صبح نہ اٹھے۔ انہیں شاید کسی کی محبت پر اس قدر اعتماد ہی نہ تھا کہ وہ مرنے سے پہلے بیمار ہوتے، کسی سے سیوا خدمت کراتے، عمر بھر کے حساب چکاتے، وعدے وعید کرتے، وصیت نصیحت چلتی۔ بس گلی میں ان کی چارپائی بچھی تھی، رات کے پچھلے پہر ذرا سی خنکی ہو جاتی تھی۔ انہوں نے مرنے سے پہلے اپنا منہ سر سفید کھیس میں چھپا لیا اور خود ہی اپنا کفن اوڑھ کر سو گئے۔ شاید وہ نہانے چلے گئے تھے اور واپس آنا بھول گئے تھے۔

امریکہ میں بڑے شہروں کی زندگی شہد کے چھتے کی مانند گزرتی ہے۔ ہر وقت کی مصروفیت...... لیکن بڑے شہروں سے دور چھوٹے شہروں میں دیہاتوں میں ابھی ترقی

نے اپنے ناخن اس قدر نہیں گاڑے' وہاں محبت فرض اور شادی مقدس لفظ ہیں۔ امریکی دیہات دیکھ کر لگتا ہے کوگیا یہ سارے آدرشی لوگ ابھی اصحاب کہف کی اچھائی Addiction ہے اور یہ کسی ایسے خواب میں گھوم پھر رہے ہیں' جہاں سے ابھی ابھی حضرت عیسیٰ ہو گزرے ہیں اور خدا کی وحدانیت اور اچھائی اور نیکی کا حکم نافذ ہو چکا ہے۔

میں گزبو میں اکیلا بیٹھا سوچتا ہوں۔ پتہ نہیں ارجمند کون سے دن کون سے ویک اینڈ پر مجھے واشنگٹن لے جائے گی۔ برسوں بعد اقبال کو دیکھ کر کیسے محسوس کروں گا؟ میرے خیال می بڑھاپے میں مرد کے جسم سے نکل کر عورت اس کے دماغ میں گھس جاتی ہے۔ جوں جوں وہ بوڑھا ہوتا جاتا ہے' وہ عورت کے اس قدر قریب ہو جاتا ہے کہ خود عورت بن جاتا ہے۔ جسمانی تعلقات ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اغزل الغزلات اس کی زندگی کا بہترین مشغلہ قرار پاتا ہے۔ جمعدارنی سے جھگڑنا' ماسی' پھوپھی تائی سے مشورے کرنا' بیٹیوں کی یاد میں آنسو بہانا' قبروں پر جا کر رقیق ہو جانا' ٹیلی ویژن پر کسی خاتون کی نعت یا حمد پڑھتے دیکھ کر آبدیدہ ہونا قدم قدم پر وہ جنس لطیف کا زرخرید بنتا جاتا ہے۔ ہولے ہولے عورت اس کی سائیکی کا بڑا حصہ بن جاتی ہے۔ میں نے بھی اقبال کے بغیر ساری جوانی مزے میں گزار دی' لیکن اصغری کی وفات کے بعد یہ تعلق پھر ہرا ہو گیا اور سردیوں کا موسم گزرنے پر جس طرح جھونجھ انار کا بوٹا لہلہا اٹھتا ہے' ایسے ہی میرے تعلق کے انار میں بڑے خوبصورت شگوفے نکل آئے اور میں ان انار کی کلیوں کو کبھی سونگتا' کبھی ان کے رنگ سے مسحور ہو جاتا۔

ارجمند دور سے رومال ہلاتی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں اٹھ کر اس کی طرف چلنے لگا اور ہم دونوں سڑک کنارے جا ملے۔

''ابو جی آپ پلیز گھر آ جائیں.....''

''کیوں؟؟.....''

''بات یہ ہے کہ ہم دونوں تین دن کے لیے جاپان جا رہے ہیں۔ بلال کی وہاں کوئی کانفرنس ہے، مجھے بریک مل جائے گی.....''

اور بچے..... جمشید اور قیصر.....''

''وہ آپ کے پاس ہیں۔ رات کو یا آپ ان کے کمرے میں سو جائیے گا یا وہ آپ کے کمرے میں گدے بچھا لیں گے۔۔۔۔''

میں نے کبھی اپنے بچوں کی Baby sitting نہ کی تھی۔ مجھے یہ حکم نامہ کچھ عجیب سا لگا..... مجھے اصغری یاد آ گئی اس نے کبھی کسی بچے کو میری گود میں نہ دیا۔

''اچھا.....''

''آپ گھبرائیں ناں۔ بچے بہت Behaved ہیں۔ وہ آپ کی ساری باتیں مانیں گے۔''

ہم دونوں گھر کی طرف چلنے لگے۔ میں نے ارجمند سے پوچھنا چاہا کہ ہم تو ویک اینڈ پر واشنگٹن ڈی سی جانے والے تھے۔ وہاں ہمیں ایمبسی میں ٹریڈ منسٹر نثار سے ملنا تھا..... اور اتنے برسوں بعد اتنے جگ بیت جانے کے بعد اقبال کو دیکھنا تھا لیکن.....

بچے ہمارے آگے آگے ٹپوسیاں مارتے چل رہے تھے اور ہم دونوں ان سے پیچھے اپنی اپنی دنیا میں گم تھے۔ سارا علاقہ صاف شفاف، دھلا دھلایا۔ اجلا اجلا صبح کی شیر گرم دھوپ میں نگینے کی طرح چمک رہا تھا۔ مین سڑک کے پار سو پر مارکیٹ کی عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔

''ابو جی آپ کو ذرا فون کا خیال رکھنا پڑے گا۔۔۔''

''وہ تو میں عادتاً رکھ لوں گا''

''بات یہ ہے کہ میں نے آنٹی اقبال کو فون کیا تھا کہ میں جاپان جا رہی ہوں لیکن وہ گھر پہ نہیں تھیں، میں نے آنسرنگ مشین پر پیغام تو چھوڑا ہے لیکن کئی بار لوگ راستے

کو اتنے تھکے ہوتے ہیں کہ پیغام بھی نہیں سنتے ۔انکل نثار تو Call back کے معاملے میں ذرا سست واقع ہوئے ہیں۔لیکن آنٹی ضرور فون کریں گی۔۔۔۔"

ایک امید کی کرن۔۔۔قوس قزح کا منظر وہی آواز وہی مٹھاس۔۔۔۔امرت رس کانوں میں گھلے گا۔اقبال کا فون!

"لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ لوگ آ نہ جائیں۔پھر آپ کو مشکل ہوگی"

"نہیں نہیں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔۔۔۔۔میں کاف چائے بنانا جانتا ہوں"

"ٹی بیگز ختم ہو گئے ہیں۔وہ وال مارٹ سے لانا پڑیں گے۔۔۔۔" ارجمند کسی ماڈل کی طرح کمر کو لہے لچکاتی ہوئی cat walk چل رہی تھی۔اس کی چال دیکھ کر مجھے تھوڑی سی حیرانی ہوئی کیونکہ وطن میں تو گھیر دار شلواروں میں اس کے انداز یہ نہیں تھے۔وہ اپنا پرس کھولے کچھ دیکھنے لگی۔

"میں آنٹی اقبال کی تصویر تلاش کر رہی تھی ۔۔۔۔پتہ نہیں کہاں ہے۔۔۔۔کہاں ہے ۔۔۔۔کہاں ہے" وہ sing song آواز بدلتی چلی گئی ۔اگر وہ آ گئی تو آپ انہیں پہچان سکیں ۔"تم فکر نہ کرو۔۔۔میں اسے پہچان لوں گا۔۔۔۔"

"بس ذرا وہ اپنے آپ کو انٹرویوس کرانے میں embarrased نہ ہوں۔۔۔۔"

وہ جلدی جلدی پرس کے مختلف خانے دیکھ رہی تھی۔

"چلیے ۔۔۔اب آپ انہیں اچھی طرح سے Receive کر لیجئے گا ۔۔۔۔تصویر تو ملی نہیں۔جب مین یہاں نئی نئی آئی تھی تو آنٹی اقبال نے میرا بہت خیال رکھا تھا۔میں لاہور کو یاد کر کے رویا کرتی تھی امی کی طرح مجھے دلاسے دیا کرتی تھیں کہ بیٹی شروع میں سب کا یہی حال ہوتا ہے ۔ہولے ہولے دل لگ جاتا ہے۔۔۔۔"